اسلامی فلاحی مملکت
اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں

ڈاکٹر حافظ محمد یونس

اسلامی فلاحی مملکت یا ریاست سے مراد وہ علاقہ ہے جہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور اسلامی احکام جاری ہوں ۔

کوئی ریاست یا ملک اس وقت تک صحیح طور پر بامقصد نہیں ہو سکتا جب تک نظم و نسق چلانے کے لیے حکومت نہ ہو۔ اگر حکومت نہ ہو تو ملک میں افراتفری پھیل جائے گی، بدنظمی اور فساد کا دور دورہ ہوگا۔ حکومت اسی وقت چل سکتی ہے جب کہ اس کے احکام و قوانین پر وہاں کا شہری پوری طرح کاربند ہو۔ لہٰذا حکومت قائم رکھنے کے لیے شہریوں کا اطاعت گزار ہونا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا حکم ہے:

"یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم"[1]

(اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی پیروی کرو اور تم میں سے جو برسراقتدار ہو اس کی اطاعت کرو۔)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی اس بارے میں بڑے تاکیدی ہیں آپ نے فرمایا:

"من اطاعنی فقد اطاع اللہ و من عصانی فقد عصی اللہ و من

---

[1] القرآن الحکیم، النساء، آیت : ۵۹ ۔

اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی[1]

(جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی)

اسی سلسلے میں ایک دوسری حدیث ہے:

"اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ"[2]

(اگر تم پر کوئی چھوٹے سر والا غلام بھی حاکم بنا دیا جائے اور (وہ کتاب اللہ کے مطابق حکم چلائے) تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو)

قیام مملکت کا بنیادی مقصد

ارسطو نے لکھا ہے:

"ریاست کی غرض وغایت یہ ہے کہ اہل ریاست کے لیے حسن سیرت اور خوبی کردار کا ذریعہ بنے اس کا وجود خیر کی زندگی کیلیے ہے لہٰذا اس کے قوانین ایسے ہونے چاہئیں جن سے لوگوں میں صفات خیر کی پرورش ہو"[3]

ارسطو کے نزدیک ریاست کے دو مقاصد ہیں:

(الف) اس فطری تقاضے کو پورا کرنا کہ انسان ایک دوسرے سے میل جول پر مائل ہوں۔

(ب) اس مشترکہ مفاد کی تکمیل جس کی حیثیت محض معاشی نہیں بلکہ اچھی زندگی کا حصول اور اس کے لیے ایسے نظامات کا قیام ہے جو انسان کے لیے خیر کا موجب بنتے ہیں۔ چنانچہ ریاست کا سب سے بڑا فریضہ حصول خیر ہی ہے[4]

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، ج ۲، ص ۱۰۵۷، مطبع اصح المطابع، نور محمد، آرام باغ کراچی

[2] الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، ج ۲، ص ۱۰۵۷

[3] احمد لطفی السید، السیاسۃ لارسطوطالیس، فصل ۳، باب ۹، ص ۱۴۳

[4] ایضاً، کتاب ۳، باب ۵، ص ۲۰۴

ازدشیر شاہنشاہ ایران نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔

"ان الملك والعدل اخوان لاغنی باحدهما عن الآخر فالملك أس والعدل حارس"[1]

(مملکت اور عدل دو بھائی ہیں جو لازم و ملزوم ہیں (اور ایک دوسرے کے بغیر ان کا وجود بے فائدہ ہے)، مملکت تو بنیاد اور اساس ہے اور عدل محافظ)

لہٰذا مملکت کا وجود رعیت کی بہتری ہی کے لیے ہے۔

عباسی خلیفہ منصور کہا کرتا تھا:

"سلطنت کے چار ارکان ہیں، جن کے بغیر حکومت نہیں چل سکتی، ایک قاضی، جو بلا خوف منصفانہ فیصلے کرے، دوسرے پولیس جو قومی کے مقابلے میں کمزور سے انصاف کرے، تیسرے تحصیل دار مالیہ، خراج اور لگان وصول کرے لیکن رعایا پر ظلم نہ ہونے پائے، چوتھے پرچہ نگار (یعنی اطلاعات و نشریات کا شعبہ) جو (ان لوگوں کو) صحیح اطلاع دیتا رہے"[2]

قیام مملکت کا بنیادی مقصد

اسلام نے مملکت یا ریاست کا مقصد ایک صالح اور پاکیزہ معاشرے کا قیام قرار دیا ہے۔ اسی مقصد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی زندگی میں مملکت کی بنیاد رکھی۔ حضور کی حکومت الٰہی حکومت تھی کہ اس کا مقصد دعوت دین، اصلاح اخلاق، تزکیۂ نفس اور رعیت کی بہتری اور خوبی کردار تھی۔ قرآن مجید میں اسلامی مملکت کا مقصد متعین کر دیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

"الذین ان مکناهم فی الارض اقاموا الصلوٰة وآتوا الزکوٰة وامروا بالمعروف ونهوا عن المنکر ولله عاقبة الامور"[3]

---

[1] ابن عبد ربہ، العقد الفرید، ج ۱، ص ۲۷

[2] ابن اثیر الجزری، الکامل فی التاریخ ج ۵، ص ۹

[3] القرآن الحکیم، الحج، آیت ۴۱

(یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے)

اس آیت میں اسلامی مملکت کے نصب العین اور اس کے کارکنوں اور کارفرماؤں کی خصوصیات کا جوہر نکال کر رکھ دیا ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ اسلامی حکومت فی الواقع کس چیز کا نام ہے۔

انبیاء کرام نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کی اور وقت کی اجتماعی قوت کو خیر اور عدل کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے۔ قرآن کریم اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کی اور اسلامی اصول وضوابط کے ساتھ اسے چلاتے رہے۔

قرآن مجید میں ہے:

"اولٰئک الذین اٰتیناھم الکتاب والحکم والنبوۃ"[1]

(یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی)

یہاں انبیاء علیہم السلام کو تین چیزیں عطا کئے جانے کا ذکر ہے ایک کتاب یعنی اللہ کا ہدایت نامہ، دوسرے حکم یعنی اس ہدایت نامہ کا صحیح فہم اور اس کے اصولوں کو معاملات زندگی پر منطبق کرنے کی صلاحیت، اور مسائل حیات میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کی خداداد قابلیت، تیسرے نبوت یعنی یہ منصب کہ وہ اس ہدایت نامہ کے مطابق خلق اللہ کی رہنمائی کریں۔

بائیبل اور تالمود کے مطالعے سے دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے بارے میں بھی شہادت ملتی ہے کہ وہ مملکت کے ادارے کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے اور غلط قیادت پر تنقید کرتے رہے تورات میں ہے:

"جو شخص بے باک ہو کر گناہ کرے، وہ خداوند کی اہانت کرتا ہے وہ شخص اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے گا"[2]

---

[1] القرآن حکیم، الانعام، آیت ۸۹

[2] تورات، گنتی ۱۵ : ۳۰

حضرت داؤد علیہ السّلام نے زبور میں بنی اسرائیل کو فساد اور اس کے بُرے نتائج پر تنقید کی تھی اور پھر جب فسادِ عظیم رونما ہوگیا تو اس کے نتیجے میں آنے والی تباہی کی خبر حضرت عیسیٰ نبی نے اپنے صحیفے میں دی۔

مملکت اسلامی کے قیام کا مقصد وحید ہی یہ ہے کہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو نہ صرف پیش نظر رکھا جائے بلکہ انہیں زندگی کے ہر شعبہ میں جاری و ساری کیا جائے، کیونکہ اس کے بغیر قرآن مجید کا اکثر و بیشتر حصّہ ناقابل عمل ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جہاں نماز، روزے کے احکام ہیں وہاں آداب معاشرت اور اصول تمدن بھی بیان ہوئے ہیں۔ معیشت اور سیاست کے بارے میں بھی واضح ہدایات پائی جاتی ہیں وہ تمام آیات اور احادیث جو اصول تمدن، معیشت اور سیاست سے متعلق ہیں، بالکل معطل ہو کر رہ جاتی ہیں اگر مملکت اسلامیہ کا قیام عمل میں نہ آئے۔ اس لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ مملکت اسلامیہ کے قیام کے لیے مسلسل کوشش کرتا رہے اور غیر اسلامی نظام کو ختم کرنے کے لیے پوری قوت اور جوانمردی کے ساتھ تگ و دو کرتا رہے۔

حاکمیت اعلیٰ کا تصوّر

چونکہ اس کائنات کا خالق وہ مالک اللہ ہے، اس لیے حاکمیت اعلیٰ اور امر کا حق بھی اسی کو پہنچتا ہے، اس کی مملکت میں اس کی مخلوق پر اس کے سوا کسی دوسرے کا حکم نافذ ہونا صریحاً غلط ہے، قرآن مجید میں ہے:

"الا له الخلق والامر"[1]

(دیکھو اسی نے پیدا کیا اور حکم بھی اسی کا ہے)۔

سورۃ الکہف میں ہے:

ولا یشرک فی حکمه احدا[2]

(وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا)۔

---

[1] القرآن الکریم، الاعرف، آیت: ۵۴

[2] ایضاً، الکہف، آیت: ۲۴

اسلام کا اصول یہ ہے کہ کوئی انسان خواہ کس قدر بھی بڑا اور بزرگ کیوں نہ ہو وہ دوسرے انسان کا حاکم نہیں ہوسکتا۔ اسلامی اصول کے مطابق حکومت صرف اللہ کا حق ہے، قانون بنانا بھی خدا کی شان ہے۔ انسان، انسان کا خادم ہوسکتا ہے حاکم نہیں ہوسکتا۔ سورۃ یوسف میں ہے :

"ان الحکم الا للہ"[1]

(حکم اللہ کے سوا اور کسی کا نہیں)

سورۃ آل عمران میں ہے :

"یقولون ھل لنا من الامر من شیء قل ان الامر کلہ للہ"[2]

(لوگ پوچھتے ہیں، کیا حاکمیت میں ہمارا بھی کچھ حصّہ ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ حاکمیت تو بس اللہ ہی کی ہے)

اسلام نے جو سیاسی پیغام دنیا کو دیا وہ یہ تھا کہ حاکم اعلیٰ خدا ہے، انسان سب کے سب اس کی رعیت ہیں۔ قانون زندگی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مکمل کرکے انبیاء کے ذریعہ بھیج دیا ہے انسان کو صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے، وہ اس قانون کے ماتحت خود بھی زندہ رہیں اور زندگی کے معاملات کا انتظام بھی کریں۔

اللہ کے قانون سے ہٹ کر جو شخص یا مملکت خود قانون بناتی ہے یا کسی اور کے بنائے قانون کو تسلیم کرتی ہے اور اس کے مطابق فیصلے کرتی ہے، قرآن مجید اس کے بارے میں فرماتا ہے :

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٓئک ھم الکافرون[3]

(اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ہیں وہ کفر صریح کا ارتکاب کر رہے ہیں)۔

ایک دوسرے مقام پر حضور علیہ السّلام کو خطاب ہو رہا ہے۔

---

[1] القرآن الکریم ، یوسف ، آیت : ۴۰

[2] ایضاً ، آل عمران ، آیت : ۱۵۴

[3] ایضاً ، المائدہ ، آیت : ۴۴

"الم تر الی الذین یزعمون انھم اٰمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به"[1]

(کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں اس پر ان کو حکم ہو چکا ہے، جو تیری طرف اترا ہے اور جو تجھ سے پہلے اترا ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ تنازعہ شیطان کی طرف لے جائیں حالانکہ خلیفہ، حاکم حقیقی کا نائب ہے۔

یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ اسلام میں حاکمیت کا حق اللہ ہی کو حاصل ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر اگر اس سوال پر غور کیا جائے کہ جو لوگ اللہ کے قانون کو اس روئے زمین پر نافذ کرنے کے لیے اٹھے ہیں ان کی حیثیت کیا ہونی چاہیے تو یقیناً یہ جواب آئے گا کہ وہ اس حاکم حقیقی کی نیابت کر رہے ہیں۔

سورۃ نور میں ہے:

"وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم"[2]

(تم میں سے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں یقیناً خلافت ارضی عطا کرے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو اس نے خلافت عطا کی)۔

اس آیت میں دو باتیں توجہ طلب ہیں۔

ا۔ اسلام نے حاکمیت کی بجائے خلافت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے حاکمیت صرف خدا ہی کی ہے اس لیے اسلامی ریاست کا سربراہ حقیقت میں اس حاکم اعلیٰ کا خلیفہ ہے جو صرف اللہ کے تفویض کردہ اختیارات ہی کو استعمال کرتا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے یہ نہیں فرمایا کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا دوں گا۔ بلکہ یہ واضح کر دیا کہ سب مومن خلیفۃ اللہ ہیں۔ خلافت کسی

---

[1] القرآن الکریم، النساء، آیت: ٦٠

[2] ایضاً، النور، آیت: ۵۵

شخص، خاندان، نسل یا طبقے کے لیے مخصوص نہیں ہے اس لیے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہر شخص اللہ کے سامنے جواب دہ ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ [۱]

(تم میں سے ہر شخص سربراہ ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا) ۔

اسلامی ریاست میں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے، اس کی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کی ذمہ داریوں کو اس کے سپرد کر دیتے ہیں اس لیے وہ ایک طرف تو خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف تمام خلفاء کے سامنے، جنہوں نے اپنی خلافت اسے سونپی ہے ۔

فضیلت کا معیار تقویٰ ہے

ایسی مملکت جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو، اس میں پیدائشی، نسلی، خاندانی امتیازات کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں تمام افراد مرتبے اور حیثیت کے لحاظ سے یکساں ہوں گے اور فضیلت کا معیار تقویٰ یعنی کردار کی مضبوطی اور ذاتی قابلیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ یہی وہ بات ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا وضاحت سے بیان فرمایا :

"یا ایھا الناس الا ان ربّکم واحد، ولا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود الّا بالتقویٰ ۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم [۲]

(لوگو! آگاہ رہو کہ تم سب کا پالن ہار ایک ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کالے کو گورے پر نہ گورے کو کالے پر کوئی فضیلت ہے ۔ فضیلت اگر ہے تو تقویٰ ہی کی بناء پر ہے، لہٰذا اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز اور محترم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ نیک اور متقی ہے) ۔

---

۱ الصحیح للمسلم، مسلم بن الحجاج، ج ۱، ص ۱۲۲

۲ کنز العمال، ج ۳، ص ۶۹۹ نمبر ۸۵۰۲

فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معزز ترین خاندان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"الحمد للہ الذی اذھب عنکم الجاھلیۃ وتکبرھا۔ یا ایھا الناس رجلان، برّ تقی کریم علی اللہ، وفاجر شقی ھین علی اللہ الناس کلھم بنو آدم وخلق اللہ آدم من تراب۔ قال اللہ تعالیٰ یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ۔"[1]

(اس ذات پاک کا شکر ہے جس نے تم سے جاہلیت اور تکبر کا داغ دھو ڈالا۔ اے لوگو! انسان تو بس دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو نیک اور پرہیزگار ہو۔ وہ اللہ کے نزدیک معزز ہے۔ دوسرا وہ جو بداعمال اور شقی ہو، وہ اللہ کے نزدیک ذلیل ہے۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا ہے)۔

ایسے معاشرے میں کسی فرد یا کسی گروہ کے لیے اس کی پیدائش یا اس کا خاندانی مرتبہ یا اس کا پیشہ اس کی ذاتی صلاحیتوں کے نشوونما اور اس کی شخصیت کے ارتقاء میں حائل نہیں ہو سکتا۔ ایسے معاشرے میں غریب اور امیر کو ترقی کے یکساں موقع حاصل ہوتے ہیں۔

خلافت راشدہ کا دور گواہی دیتا ہے کہ ملازموں اور خادموں کے بیٹے فوجوں کے سپہ سالار اور صوبوں کے گورنر بنائے گئے اور بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے سرداروں نے ان کے ماتحت بخوشی کام کیا۔ وہی لوگ مفتی، قاضی اور فقیہہ بنے، آج ان کے نام اکابر اسلام کی فہرست میں شامل ہیں۔ سلطنتِ عباسیہ اور برصغیر پاک وہند کی عظیم سلطنتیں ان کے کارہائے نمایاں کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ جنہیں تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ رکھا ہے۔

خلیفہ کا انتخاب اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ خلفائے راشدینؓ کا جو انتخاب ہوا تو کیا یہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت کے مطابق تھا۔

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب فتح مکہ: کنز العمال، ج ۱، ص ۲۵۸ - ۱۲۹۴ء۔

ظاہر ہے کہ ہمارے رسولؐ نے حکومت کے سربراہ کے انتخاب کے سلسلے میں کوئی واضح ہدایت نہیں دی۔ آپ کے یہاں حکمرانی کی ساری باتیں تو ملتی ہیں، مگر حکومت کے طرز اور تشکیل کی کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی، آپ نے ہر شعبہ زندگی کی جزوی باتوں کی واضح تعلیم دی ہے مگر طرز حکومت اور اس کی تشکیل کو بالکل غیر واضح چھوڑ دیا ہے، اسی لیے گزشتہ چودہ سو سال (۱۴۰۰) سے اس کی کوئی ایسی متعین شکل مرتب نہیں ہوسکی جو ہر اسلامی ملک میں یکساں طور پر مروج ہو۔

اس کی وجہ بظاہر تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہئیت حکومت جغرافیائی حالات اور زمانہ کے تحت بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے ایک ملک یا ایک زمانہ کا طرز حکومت دوسرے ملک اور دوسرے زمانہ کے لیے ضروری نہیں کہ مفید اور موزوں ہو۔

اسلام ایک عالمگیر اور دائمی مذہب ہے۔ جو ہر ملک اور ہر زمانہ کے لیے ہے۔ اس لیے طرز حکومت اور اس کی تشکیل کا غیر واضح رہنا ہی مناسب ہے، کہ جب جیسی ضرورت ہو، اس کے مطابق حکومت بنائی جائے۔ البتہ حکومت کے لیے کچھ بنیادی باتیں ایسی ہیں جو ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر ماحول کے لیے لازمی ہیں، ان کی وضاحت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی ہے جو ایسی اعلیٰ سیاسی تعلیمات ہیں جن پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

خلیفہ کیسا ہو؟ اسلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ اسلامی فلاحی مملکت کا سربراہ اور خلیفہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ پر ایمان رکھتا ہو۔ یعنی دنیا کی سرزمین اور اس سرزمین کا خواہ کوئی خطہ یا ملک ہو، اس کا حاکم اعلیٰ علی الاطلاق اور، شہنشاہ قادر مطلق ہی ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو "ملک الناس"، "الملک القدوس السلام" "الملک القدوس العزیز" کہتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

"اللّٰھم مالك الملك تؤتی الملك من تشاء"[1]

(اللہ تعالیٰ ہی ہر سلطنت کا مالک ہے، جس کو چاہے سلطنت دے)۔

اس لیے قانون اور حکم بھی اسی کا ہوا۔ دوسرے حکمرانوں کا حکم اسی وقت مانا جائے جب وہ عین حکم

---

[1] القرآن الحکیم، آل عمران، آیت: ۲۶

الٰہی ہو۔ یا اس پر مبنی ہو۔ یا کم از کم اس کے مخالف نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ مملکت کا سربراہ اللہ کے قوانین پر عمل پیرا ہو کر متقی ہو، پرہیزگار ہو۔ اس کی سب سے بڑی عبادت، رعایا کی خدمت، ان کے معاملات میں انصاف پسندی اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے، وہ کسی وقت بھی عوام کے کاموں کی نگرانی سے بے نیاز نہ ہو۔ قرآن مجید میں حضرت داؤدؑ کو یہی حکم دیا گیا تھا:

"یا داؤد انا جعلناك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله" [1]

(اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا)۔

"ما من امام يغلق بابه دون ذوى الحاجة والخلة والمسكنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته وحاجته ومسكنته"

جو امام یا حاکم ضرورت مندوں سے دروازہ بند کر لیتا ہے اللہ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کرے گا۔[2]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ:

"جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔"[3]

خلیفہ منصور کا قول تھا کہ:

"خلیفہ کو صرف تقویٰ درست رکھ سکتا ہے، سلطان کو اطاعت اور رعایا کو عدل، جو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہو اس کے لیے عفو و درگزر زیادہ مناسب ہے، اور وہ بڑا کم

---

[1] القرآن الحکیم، سورۃ ص، آیت: ۲۶

[2] الجامع للترمذی، ابواب الاحکام، ج ۲، ص ۳۹۵ - ۱۳۴۷

[3] الجامع الصحیح للبخاری، ج ۲، ص ۱۰۵، کتاب الاحکام

عقل ہے جو اپنے ماتحتوں پر ظلم کرتا ہے[1]"

مسلمان خلفاء اور حکمرانوں میں وہ تمام صفات جمع تھیں جو ان کو قوموں کی راہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی تھیں اور ان کی نگرانی اور قیادت میں قوموں کی فلاح و سعادت کی فراہم کرتی تھیں ان کے پاس الٰہی قانون تھا جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے تھے۔ وہ حق و انصاف کے علم بردار بنائے گئے تھے، اور ان کو سختی سے سخت اشتعال و برہمی اور عداوت و بیزاری کی حالت میں بھی انصاف اور صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے اور ذاتی انتقام لینے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

اللہ کا ارشاد ہے:

"یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون[2]"

(مسلمانو اللہ واسطے انصاف کے گواہی دینے کو تیار رہو اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو یہی بات تقوٰی سے زیادہ نزدیک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، جو تم کرتے ہو اس کی اللہ کو خوب خبر ہے)۔

در اصل مسلمان حکومت اور قیادت کے منصب پر مستحکم اخلاقی تربیت اور مکمل اصلاح نفس کے بعد فائز ہوئے تھے، بلکہ ایک طویل عرصہ تک وحی الٰہی ان کی اصلاح اور تربیت کرتی رہی تھی اور کئی سال تک وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نگرانی اور تعلیم میں رہے۔ آپ ان کا تزکیہ فرماتے رہے ان کی مکمل تربیت فرمائی تقوٰی اور پرہیزگاری کی زندگی کا عادی بنایا، عفت و امانت، ایثار و قربانی کا خوگر بنایا حکومت و مناصب کی حرص و طمع ان کے دل سے بالکل نکال دی، حضور کا ارشاد تھا کہ "بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کو سپرد نہیں کریں گے جس نے اس کی فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہے[3]"

---

[1] خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۱، ص ۵۶

[2] القرآن الحکیم، المائدہ، آیت: ۸

[3] الجامع الصحیح للبخاری، الصحیح للمسلم

خلیفہ اور رعایا احتساب میں برابر ہیں

قانون اسلام کی نگاہ میں حاکم ومحکوم، امیر وغریب، افسر و ماتحت سب برابر ہیں۔ مملکت کے سربراہ کو ایک عام آدمی کی طرح عدالت کے کٹہرے میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔ حضرت عمرؓ اور ابی بن کعبؓ میں ایک بات میں جھگڑا ہوگیا۔ دونوں کا مقدمہ حضرت زیدؓ بن ثابت کے ہاں پیش ہوا، حضرت عمرؓ جب ان کے پاس گئے، تو زیدؓ بن ثابت نے تعظیم کی خاطر جگہ خالی کردی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ابن ثابتؓ یہ پہلی ناانصافی ہے جو تم نے اس مقدمے میں کی ہے، یہ کہا اور اپنے فریق مخالف کے پاس جاکر بیٹھ گئے[1]

حضرت علیؓ کا ایک یہودی کے ساتھ زرہ کے بارے میں نزاع ہوا تو قاضی شریح کی عدالت میں حضرت علیؓ کو فریق کی حیثیت سے کھڑا ہونا پڑا[2]

عباسی دور میں اگرچہ اسلامی حکومت کی خصوصیات کم تھیں لیکن پھر بھی جب مدینے کے قلیوں نے خلیفہ منصور کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کیا تو خلیفہ کو تنہا ان قلیوں کے برابر آکر کھڑا ہونا پڑا[3]

خلیفہ مامون کے دربار میں اس کے بیٹے عباس کے خلاف ایک بڑھیا نے نالش کی تو شہزادہ عباس کو بھرے دربار میں بڑھیا کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے مقدمے کی پیروی کرنا پڑی[4]

غسانی شہزادہ جبلہ بن ایہم نے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام قبول کیا۔ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چادر پہ ایک غریب بدوی کا پاؤں پڑ گیا۔ اس نے پیچھے مڑکر اس کے ایک تھپڑ کھینچ مارا۔ اس نے بھی اس کے جواب میں جبلہ کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ جبلہ سخت غضب ناک ہوا اور حضرت عمرؓ کے پاس جاکر شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "پہلے تم نے اسے مارا، لہٰذا اس نے اپنا بدلہ لے لیا۔ اس لیے شکایت کس بات کی ہے" اس نے کہا "ہمارے ہاں بادشاہوں کے ساتھ اگر کوئی گستاخی کرے تو اس کی سزا قتل ہے" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "ہاں جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے بڑے چھوٹے

---

[1] کنز العمال، ج ۳، ص ۱۷۴

[2] ابن اثیر الجزری، الکامل ج ۳ : ص ۱۶۰

[3] تاریخ الخلفاء، جلال الدین السیوطی، بہ تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید انتشارات الشریف الرضی قم ۱۴۱۱ھ

[4] ابن عبد ربہ، العقد الفرید، ج ۱، ص ۹

کی تمیز ختم کر دی ہے۔" جبلہ اس ضد میں دوبارہ عیسائی ہو کر بھاگ گیا لیکن خلیفہ اسلام نے اسلامی مساوات کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا [1]

حضرت عمرؓ نے تمام حاکموں اور گورنروں کو لکھ بھیجا تھا۔

"انصاف میں تمام لوگوں کو برابر سمجھو، قریب و بعید میں امتیازی فرق نہ کرو"[2]

برصغیر پاک و ہند کے مشہور فرمانروا سلطان غیاث الدین بلبن (م : ۱۲۸۶ء) نے اپنے فرزندوں اور امراء و وزراء پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ "قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں کسی قسم کی رو رعایت اور نرمی کی امید نہ رکھیں"[3]

سلطان نے عملاً اپنے اس قول کو سچ کر دکھایا، بداؤن کے گورنر ملک باربک نے اپنے ملازم کو قتل کر دیا تھا، اس پر بلبن نے برسر عام اسے اس قدر کوڑے لگوائے کہ وہ مر گیا[4]

محکمہ جاسوسی کے افسر کو جس نے اس واقعہ کی اطلاع نہیں دی تھی سولی پر لٹکایا" اس طرح اودھ کے جاگیردار ہیبت خان نے نشہ کی حالت میں کسی شخص کو قتل کر دیا، مقتول کی بیوہ نے شاہی دربار میں شکایت کی تو بلبن نے ہیبت خان کو بیوہ کے سپرد کر دیا اور بیوہ کو پورا اختیار دیا کہ مجرم کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔ چنانچہ جاگیردار نے بیس ہزار تنکہ بطور دیت دے کر رہائی پائی، لیکن اس کے باوجود ندامت کے مارے ایسا روپوش ہوا کہ پھر کبھی نہ دیکھا گیا[5] بلبن کے عدل و انصاف نے جب شہرت حاصل کی تو قانون کے لیے عزت و احترام کا جذبہ خود بخود پیدا ہو گیا۔

جگر گوشۂ رسولؐ بھی اسلامی قانون سے مستثنیٰ نہ تھیں

قریش کے معزز گھرانے بنو مخزوم کی فاطمہ نامی خاتون چوری کے

---

[1] فتوح البلدان، علامہ البلاذری، ص ۱۴۲

[2] کنز العمال، ج ۳، ص ۱۷۴

[3] محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ص ۱۰۳ مقالہ دوم

[4] ایضاً ، مقالہ دوم ، اردو ترجمہ

[5] ایضاً ، مقالہ دوم ، ص ۳۰۳ (اردو ترجمہ)

الزام میں پکڑی گئی۔ حضورؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ سرداران قریش نے حضورؐ کے منظور نظر حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو سفارش کے لیے بارگاہ رسالت میں بھیجا۔ حضورؐ نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور انہیں فرمایا، کہ تم سے پہلے قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ ان میں اگر کوئی بڑا آدمی جرم کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر وہی کوئی غریب اور کم درجے کا کرتا تو اس کو سزا دیتے تھے۔

"وایم اللہ لوان فاطمہ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا[1]

(اللہ کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا)۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مصر کے ایک باشندے نے عمرو بن العاص گورنر کے بیٹے کے ساتھ دوڑنے میں بازی لگائی۔ وہ آدمی آگے نکل گیا۔ حضرت عمرو بن العاص کا بیٹا برہم ہوگیا اور اس پر کوڑے برسانے لگا اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ میں اکابرین میں سے ہوں۔ وہ شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا کہہ سنایا اور کہا کہ میں ظلم سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاصؓ کو لکھ بھیجا کہ وہ فوراً اپنے بیٹے کو لے کر حاضر ہوں۔ وہ حاضر ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے ان کی موجودگی میں ان کے بیٹے کو اس مصری سے کوڑے لگوائے اور عمرو بن العاص کو فرمایا:

"مالکم استعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احراراً[2]

(تم نے انسانوں کو کب سے غلام بنا لیا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا)

حضرت معاذؓ بن جبل جلیل القدر صحابی ہیں۔ شاہِ روم کے دربار میں سفیر بن کر گئے تھے۔ شاہِ روم نے اپنے جاہ و جلال اور تزک و احتشام سے ان کو مرعوب کرنا چاہا۔ وہ کہاں ایسے جاہ و جلال سے مرعوب ہونے والے تھے۔ انہوں نے قیصر روم کے دربار میں اسلامی فلاحی مملکت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی:

"ہمارا امیر ہم ہی میں سے ایک فرد ہوتا ہے، اگر وہ ہمارے دستور اسلامی اور ہمارے پیغمبر کی سُنت کے مطابق کام کرے تو ہم اس کی خلافت کو برقرار رکھتے ہیں اور وہ

---

[1] بخاری : ۲ : ۱۰۰۳

[2] ابن جوزی : سیرتِ عمرؓ

ایسا نہ کرے تو ہم اسے معزول کر دیتے ہیں۔ اگر وہ چوری کرے تو ہم اس کا ہاتھ کاٹ ڈالیں، اگر وہ زنا کرے تو ہم اسے تازیانے لگائیں، اگر وہ ہم میں سے کسی کو گالی دے تو وہ بھی برابر کی گالی دینے کا حق رکھتا ہے، اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کا بدلہ اسے دینا پڑے۔ وہ ہم سے چھپ کر نہیں بیٹھتا اور نہ ہمارے ساتھ تکبر سے پیش آتا ہے، اور نہ وہ اپنے آپ کو ہم پر ترجیح دیتا ہے۔"[1]

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت سنبھالتے ہی اپنی پہلی تقریر میں مسلمانوں کو فرمایا:

"لوگو! میں تمہارا خلیفہ مقرر ہوا ہوں، حالانکہ میں تم سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اے لوگو! میں تو حضورؐ کی پیروی کرنے والا ہوں۔ نظامِ حکومت کے لیے کوئی نئے اصول و ضوابط بنانے والا نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کے کام کروں تو میری مدد کرو۔ اگر میں ٹیڑھا ہوں تو مجھے سیدھا کرو۔ اگر میں خدا اور اس کے رسول کا کہا مانوں تو تم بھی میرا کہا مانو اور اگر میں ان کے حکم سے سرتابی کروں تو میری اطاعت نہ کرنا۔"[2]

دورِ حاضر کی متمدن قوموں کی عدالتیں اعلیٰ اور ادنیٰ میں اب بھی تفریق کرتی ہیں، اب بھی مہذب ترین ممالک میں سیاہ و سفید قوموں کے افراد اپنی عبادت گاہوں میں مل جل کر ایک ہی صف میں نہیں بیٹھ سکتے۔ لیکن مسجدوں میں آج بھی ایک ادنیٰ درجے کا مسلمان سربراہِ مملکت کے دوش بدوش کھڑا ہو سکتا ہے اور کوئی اسے ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا۔ اسلامی مساوات کے واقعات بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ اسلام میں آج بھی اجتماعی عدل موجود ہے۔

سینکڑوں سال گزرنے کے باوجود آج بھی اگر ہم برصغیر پاک و ہند کے مسلمان سلاطین اور ان کے وزراء کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے عام لوگوں کے قریب اور قوم کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے۔ ان کی سیرت پر ایک نظر ڈالنے سے ان کی عالی ہمتی، بلند حوصلگی کمالات و خصوصیات کے تنوع، شاہی لباس کے اندر درویشی، سیاسی مہمات میں انہماک کے ساتھ تقویٰ و خوفِ خدا، عبادت کی مشغولیت و سرگرمی اور علمی ذوق کے ایسے نادر نمونے ملیں گے

---

[1] فتوح الشام، ص ۱۸۵

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج ۳، ص ۱۲۹

جن کی نظیر عام انسانی تاریخ میں ملنی آسان نہیں، سلطان شمس الدین التمش (م: ۱۲۳۶ء) کی سلطنت کی وسعت اور اس کی ملکی، سیاسی مصروفیت کا حال ہر تاریخ کا طالب علم جانتا ہے لیکن اس کی انتظامی مشغولیت، شاہانہ ضروریات و مطالبات، جنگوں وسفروں کی کثرت اس کی مذہبی رجحان کو کم نہ کر سکی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ "میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کی کبھی عصر کی سنتیں اور تکبیر اولیٰ فوت نہ ہوئی ہو۔ جب ان کی وصیت کا اعلان کیا گیا تو سلطان آگے بڑھا اور اس نے نماز جنازہ پڑھائی اور یہ کہا کہ آج اس نے ہمیں بھی دنیا کے سامنے ننگا کر دیا۔"[۱] اسی سے ان کی خدا خوفی اور عوام کی قربت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن (م: ۱۲۸۷ء) ناصر الدین محمود (م: ۱۲۶۶ء) اور فیروز تغلق (م: ۱۳۸۸ء) کے تقویٰ اور عدل و انصاف کا حال کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے بایں ہمہ وہ رعایا کی خبر گیری اور ان کی دیکھ بھال میں ذاتی دلچسپی لیتے تھے، تاریخی واقعات اس کے شاہد ہیں۔

سلطان شمس الدین التمش (م: ۱۲۳۶ء) برصغیر پاک و ہند کا ایک عظیم مسلم فرمانروا تھا۔ اس جیسا نیک، شفیق اور علم و فضل کا قدردان کوئی حکمران تخت دہلی پر نہیں بیٹھا وہ صوم و صلاۃ کا پابند اور نماز جمعہ مسجد میں جا کر ادا کرنے کا عادی تھا۔[۲]

شیر شاہ سوری (م: ۱۵۴۵ء) جیسا عادل و منصف اور معروف ترین بادشاہ جس کو پانچ برس کی مدت میں ایک صدی کا کام کرنا تھا اور جس کو بظاہر اپنی انتظامی و سیاسی مشغولیت سے لمحہ کی فرصت نہیں ہونی چاہیے تھی اس کے اوقات و معمولات کی جو فہرست مؤرخین نے تاریخ میں محفوظ کر دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دسویں صدی ہجری میں اس گئے گزرے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کی منہ بولتی تصویر تھا جو نہ صرف خود متقی و پرہیز گار تھا بلکہ اپنی سلطنت کو اسلامی فلاحی مملکت بنانے میں پوری طرح کوشاں رہا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ عبادات و معمولات پر سختی سے کاربند رہا۔ اس کے باوجود وہ رعایا اور عوام کے مسائل سے بے خبر نہیں تھا اور ان سے رابطہ رکھتا تھا" امور سلطنت سے فارغ ہو

---

[۱] ابوالحسن علی ندوی، مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص ۳۶۸

[۲] منہاج سراج، تاریخ طبقات ناصری

کہ اہل مقدمہ اور داد خواہوں کی طرف متوجہ ہوتا اور ان کی داد رسی او رحاجات برآری کرتا[1]

سلطان اورنگ زیب عالمگیر (م : ۱۷۰۷ء) کا زمانہ کتنا پُر آشوب اور تلاطم خیز تھا۔ اس زمانہ میں اس کو سلطنت کی از سرِ نو تنظیم کرنی پڑی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی زندگی کا مقصد سلطنت کے جاہ وجلال شان وشوکت اور ناز ونعم کے بجائے صرف رعایا کی خدمت وراحت رسانی کو قرار دیا، وہ رعایا کے امور اور ان سے میل ملاپ میں پوری طرح دلچسپی لیتا رہا، ان کے ساتھ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتا تھا، ڈاکٹر جمیل کریری، جس نے ۸۰ برس کی عمر میں عالمگیر کو دیکھا تھا بیان کرتا ہے کہ :

"وہ صاف وشفاف ململ کی پوشاک پہنے ہوئے عصائے پیری کے سہارے کھڑا ہوا داد خواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا تھا، اور بلا عینک پڑھ کر خاص اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا اور اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مصروفیت سے نہایت شاداں وفرحاں رہتا ہے"[2]

مسلمانوں کی نگاہ میں تمام قومیں اور تمام انسان ایک ہی حیثیت رکھتے تھے وہ بندگان خدا کو اپنے جیسے تمام انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کی بندگی میں داخل کرنا چاہتے تھے یہی بات مسلمانوں کے سفیر ربعی بن عامر نے یزدگرد شاہِ ایران کے بھرے دربار میں کہی تھی کہ اللہ نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے کہ لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف، دنیا کی تنگی سے رہائی دے کر اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم وستم سے نجات دے کر اسلام کے عدل وانصاف میں لائیں[3]

سرکاری ملازمین کا تقرر اور ان کا احتساب

خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل کی روشنی میں ایک اسلامی فلاحی مملکت میں سرکاری ملازمین کا تقرر اہلیت اور استحقاق ہی کی بنا پر ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق فرماتے ہیں کہ میں نے

---

[1] ابوالحسن علی ندوی، مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص ۳۷

[2] ترجمہ تاریخ الفنسٹن صاحب، ص ۱۳۳، مطبوعہ علی گڑھ

[3] ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ، (ذکر شاہ یزدگرد شاہ ایران)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ" جو کوئی مسلمانوں کا حاکم یا سربراہ مقرر ہو اور وہ کسی کو اہلیت اور استحقاق کے بغیر کسی عہدے پہ فائز کرے، اس پہ اللہ کی لعنت ہو، اللہ اس کا کوئی عذر اور فدیہ قبول نہ کرے گا"[1]

نا اہل اور غیر موزوں شخص کے تقرر کی بنا پہ جتنی بھی خرابیاں اور بے اعتدالیاں پیدا ہوں گی، سربراہ مملکت اس میں برابر کا شریک ہوگا۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے :

"من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها وكان الله على كل شئ مقيتا"[2]

(جو کوئی نیک بات میں سفارش کرے اس کو بھی اس میں سے ایک حصہ ملے گا اور جو کوئی بری بات میں سفارش کرے تو اس پر بھی اس میں سے بوجھ ہوگا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ نگہبان کافی ہے)۔

خلفائے راشدین حکام اور ذمہ دار افسران کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ ان کا سخت احتساب ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ اپنے ہر عامل سے عہد لیتے تھے، کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی سے اجتناب کرے گا۔ ریشمی لباس نہیں پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا اور اپنے دروازے پہ دربان نہیں بٹھائے گا۔ اور ضرورت مندوں کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا[3]

حج کے زمانے میں اعلان عام ہوتا تھا کہ جس کسی سرکاری افسر یا عہدے دار سے کسی کو شکایت ہو وہ فوراً خلیفہ کے پاس چلا جائے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی شکایتیں بھی حضرت عمرؓ کے پاس لاتے تھے اور وہ موقع پر ہی ان پر عمل درآمد کراتے تھے[4]

حضرت عثمان غنیؓ اگرچہ ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور حلم و بردباری ان کے خمیر میں شامل تھی لیکن

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۶

[2] القرآن الکریم، النساء، آیت : ۸۵

[3] امام ابویوسف، کتاب الخراج، ص ۶۶

[4] الطبری محمد ابن جریر، تاریخ الامم والملوک، ص ۲۶۸۰

ان کے مزاج کا دھیما پن قومی اور معاملات میں انہیں احتساب سے نہیں روکتا تھا ۔ سعدؓ بن ابی وقاص نے بیت المال سے ایک بہت بڑی رقم لی جسے وہ ادا نہ کر سکے ۔ حضرت عثمانؓ نے نہایت سختی سے بازپرس کی اور معزول کر دیا[1] ولید بن عقبہ نے بادہ نوشی کی تو معزول کر کے اعلانیہ حد جاری کی[2]

خلفائے راشدینؓ حکام کی جس انداز میں نگرانی کرتے تھے ۔ اس سے کسی عامل کو رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی اور بددیانتی کی جرأت نہ ہوتی تھی ۔ سب سے سخت محاسبہ وہ اپنی ذات کا کرتے تھے ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمال و حکام سے خصوصیت کے ساتھ رپورٹ طلب فرمایا کرتے تھے اور ان کا کڑا محاسبہ کیا کرتے تھے ۔ بخاری شریف میں ہے ۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن لتبیہ الازدی کو بنی ذبیان کی جانب صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا ۔ جب وہ وہاں سے واپس آئے تو حضورؐ نے ان کا محاسبہ فرمایا اور ان سے پوری رپورٹ طلب فرمائی[3]"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عمال کا محاسبہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے، اگر انکی کسی قسم کی خیانت ظاہر ہوتی تو انہیں معزول کر دیتے اور اس کی جگہ نیا امین و دیانتدار شخص مقرر فرماتے[4]

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اموی حکومت کے پورے نظام میں انقلاب لانے کی بھرپور کوشش کی ۔ آپ کا اصلی مقصد خلافت راشدہ کا دوبارہ احیاء تھا، لیکن اموی حکومت کو دوبارہ جمہوری بنا دینا آپ کے اختیار میں نہ تھا اس لیے آپ کم سے کم اسکی برائیاں دور کر کے طرز حکومت میں اس کو خلافت راشدہ سے قریب تر کر دینا چاہتے تھے ۔ آپ نے بیت المال کی حفاظت کا نہایت سخت انتظام کیا، ذرا سی بے احتیاطی پر سخت بازپرس کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ یمن کے بیت المال سے ایک اشرفی کم ہو گئی آپ نے وہاں کے افسر خزانہ کو لکھا ۔ میں تمہاری امانت پر بدگمانی نہیں کرتا لیکن تم کو لاپروائی کا مجرم قرار دیتا ہوں، اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے مال کا

---

[1] الطبری محمد ابن جریر، تاریخ الامم والملوک، ص ۲۸۱۱

[2] ایضاً ، ۲۸۴۹

[3] الجامع الصحیح للبخاری، ج ۴، ص ۱۵۰، المطبع المیمنیہ مصر، مسلم، ج ۲، ص ۱۲۳

[4] ابن قیم الجوزیہ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، ج ۲، ص ۷۴ (تحقیق محمد حامد الفقی، مطبعہ السنہ المحمدیہ مصر، القاہرہ ۱۹۵۳ء

دعوے دار ہوں، تم پر لازم ہے کہ اپنی صفائی میں شرعی قسم کھاؤ[1]۔ خراسان کے حاکم یزید بن مہلب کو خیانت کے جرم میں معطل کر دیا[2]۔

حزب مخالف کا تصور

اسلامی فلاحی مملکت کی مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ میں اس بات کا قطعاً کوئی ایسا تصور نہیں کہ کچھ لوگ حزب مخالف بن کر بیٹھ جائیں اور ان کا کام صرف حزب اقتدار پر تابڑ توڑ حملے کرنا ہو اور جائز ناجائز کی مخالفت ہی کرنا ضروری ہو، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اسلامی نظام حکومت کا یہ تقاضا ہے کہ اگر سربراہ مملکت یا خلیفہ اور حاکم بھلائی کی بات کرے تو مجلس شوریٰ کے تمام ارکان کا فرض ہے کہ اس کی تائید و حمایت کریں اور اگر امیر یا صدر مملکت غلط بات کہے اور باطل کی طرف جھک رہا ہو۔ تو مجلس شوریٰ کے تمام ارکان پر واجب ہے کہ اس کی بات کو رد کریں اور اسے سیدھی راہ پہ لائیں، خود وزراء اور ممبران پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ سربراہ مملکت، وزیر اعظم اور خلیفہ و امیر کی غلط باتوں پر ان سے اختلاف برملا کریں اگر کوئی بات درست ہے تو سب اسے درست کہیں اور اگر وہ بات درست نہیں ہے تو سبھی ممبر بے لوث اور بے لاگ ہو کر اسے غلط قرار دیں، یہی بات تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہوتے ہی اپنے اولین خطاب میں واضح کی تھی:

"ان احسنت فاعینونی وان عصیت فقومونی[3]"

(اگر میں بھلائی کے کام کروں تو میری اعانت کرو اور اگر بدی کی راہ اختیار کروں مجھے سیدھا کر دو)

اعانت کے سلسلے میں تو یہ ممکن ہے کہ افراد اپنی انفرادی حیثیت میں تعاون کریں۔ لیکن کسی غلط کار حکمران کو سیدھا کرنا اجتماعی کوششوں کے بغیر کم از کم بعض صورتوں میں تو ہرگز ممکن نہیں۔ اس مقصد کے لیے تمام جائز ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے عام

---

[1] ابن جوزی: سیرۃ عمر بن عبد العزیز

[2] تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳۰۳

[3] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج ۳، ص ۱۲۹

جلسوں کا انعقاد، رسائل و جرائد کی نشر و اشاعت، رائے عامہ کو تحریک دینا اور ایسے ہی دیگر ذرائع سے کام لیا جانا چاہیے، بلکہ امام غزالی کے استاد امام الحرمین عبد الملک الجوینی (۴۷۸ھ) نے تو ایک غلط کار اور نا اہل حکمران کو جدا کرنے کے لیے ہتھیار اٹھانے اور تحریک چلانے کو بھی ضروری قرار دیا ہے [۱] اندلس کے ایک مفسر و محقق ابن عطیہ نے تو ایسے حکمران کو جو شوریٰ سے بالا بالا معاملات کو طے کر دینے کا عادی ہو اسے معزول کر دینے کو فرض قرار دیا ہے [۲]

اسلامی تاریخ میں ایسی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ اسلامی فلاحی مملکت کا سربراہ صرف مجلس شوریٰ یا پالیمنٹ ہی کے سامنے جواب دہ نہ تھا بلکہ پوری قوم کے سامنے اپنے ہر کام کے لیے یہاں تک کہ اپنی ذاتی زندگی کے معاملات کے لیے بھی جواب دہ تھا۔ وہ پانچوں وقت مسجد میں عوام کا سامنا کرتا تھا، ہر جمعہ کو عوام سے خطاب کرتا اور عوام اپنے گلی کوچوں میں ہر روز اسے چلتے پھرتے دیکھ سکتے تھے اور ہر شخص ہر وقت اس کا دامن پکڑ کر اپنا حق مانگ سکتا تھا اور ہر شخص مجمع عام میں اس سے باز پرس بھی کر سکتا تھا۔

اسی طرح رعایا کے ہر فرد کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا حق وصول کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ محسوس نہ کرے، بلکہ وہ اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے میں بھی کسی قسم کا باک محسوس نہ کرے، اور نہ ہی اپنے معاملات کو مملکت کے ارکان تک پہنچانے میں کسی ممبر پارلیمنٹ کا محتاج ہو۔

سربراہ مملکت کے اخراجات

کسی ریاست کے لیے اس سے زیادہ شرم ناک بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس میں چند افراد کے لیے تعیش کے اسباب مہیا ہوں اور آرام و آسائش کے تمام وسائل اور ذرائع میسر ہوں، جبکہ اس ریاست کے لاکھوں باشندوں کو پیٹ بھرنے کے لیے خشک روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے جھونپڑی تو درکنار کپڑا تک میسر نہ ہو، یہ شرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے عام لوگوں اور سربراہ مملکت کو اخراجات کے لحاظ سے ایک جیسا قرار دیا ہے۔

---

[۱] تفتازانی، شرح المقاصد، ج ۳، ص ۲۷۲

[۲] الشوکانی، فتح القدیر، ج ۱، ص ۳۶۰ (آیت آل عمران وشاورہم فی الامر)

مدینے کا وہ قدوس فرمانروا چٹائی پر سوتا تھا اور اس کے جسم اطہر پر داغ پڑ جاتے تھے، اس کے جانشین عین اس وقت جبکہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹنے والے تھے، پھٹے ہوئے کمبلوں سے اپنا تن ڈھانپے ہوئے تھے اور پتوں کی جھونپڑی کے نیچے سوتے تھے، وہ سرکاری خزانے کی پوری دیانت داری سے حفاظت کرتے تھے، اور اپنے اخراجات سے اس میں سے ایک کوڑی بھی زیادہ نہیں لیتے تھے، وہ بیت المال کو مسلمانوں کا مشترکہ خزانہ سمجھتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کپڑے کے تاجر تھے، خلیفہ ہونے کے باوجود بیت المال میں سے ایک حبہ بھی نہ لیتے تھے، لوگوں کے اصرار پر تجارت کا کاروبار بند کرنا پڑا اور بیت المال میں سے اس وضاحت کے ساتھ وظیفہ لیا کہ اس کے بعد ان کی تجارت کی آمدنی بیت المال میں منتقل ہو جائے گی۔ آپ نے فرمایا:

فسیأکل آل ابی بکر من ھذا المال ویحترف للمسلمین فیہ[1]

(اب آل ابوبکر بیت المال سے روزی کے مطابق مال لے گی اور مسلمانوں کے لیے پیشہ کرے گی)۔

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے "یہ خزانہ عمر اور اس کے خاندان کا نہیں ہے"[2]

ایک بار حج کو گئے تو آمد و رفت میں ۸۰ درہم خرچ ہو گئے، ان کو اس قدر افسوس ہوا کہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے اور کہتے تھے:

"ما اخلقنا ان نکون قد اسرفنا فی مال اللہ تعالیٰ"[3]

(یہ کس قدر نامناسب بات ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے مال میں فضول خرچی کی)۔

ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے خود ہی اپنے مصارف اور اخراجات بتلائے تھے:

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ بیت المال سے مجھے کس قدر لینا جائز ہے، دو جوڑے کپڑے ایک سردی کے موسم میں اور ایک گرمی کے موسم میں، ایک سواری جس پر حج اور عمرہ ادا

---

[1] ابن حجر، اسد الغابہ فی تمییز الصحابہ، ج ۴، ص ۷۲

[2] کنز العمال، ج ۶، ص ۳۴۶

[3] ایضاً، ج ۶، ص ۳۴۷

کر سکوں اور قریش کے ایک متوسط الحال آدمی کے اخراجات اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے لے سکتا ہوں اس کے بعد میں عام مسلمانوں میں سے ایک فرد ہوں، جن حالات سے انہیں سابقہ پڑے گا۔ انہی حالات سے میں بھی دوچار ہونگا۔[1]

حضرت حسنؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ خطبہ دے رہے تھے میں نے شمار کیا تو ان کے تہبند میں بارہ پیوند تھے[2] حضرت عثمان غنیؓ اپنے عہد خلافت میں بھی بڑے مالدار تھے انہوں نے اپنے واجبی اخراجات کے لیے بھی بیت المال سے کچھ نہیں لیا تھا[3]

ایک دفعہ حضرت عتبہ بن فرقد نے حضرت عمرؓ کے پاس کھانے کی کوئی عمدہ چیز بھیجی تو انہوں نے پوچھا، کیا تمام مسلمان یہی کھاتے ہیں بولے نہیں، اسی وقت ان کو لکھ کر بھیجا کہ یہ تمہاری یا تمہارے باپ کی کمائی نہیں جو خود کھاؤ وہی تمام مسلمانوں کو کھلاؤ[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترتیب یافتہ یہ عظیم لوگ اپنے اوپر عائد ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہو جاتے تھے، جب وہ کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو اس کو مال غنیمت یا لقمہ تر نہ سمجھتے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے اور یقین رکھتے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں ابو رافع کو فرمایا کہ:

"جب فاطمہؓ کے ساتھ میری شادی ہوئی تو میرے پاس مینڈھے کی صرف ایک کھال تھی جس پر رات کو سوتا تھا اور دن کو اسی پر مویشی کو چارہ ڈالتا تھا، ایک غلام تک میرے پاس نہ تھا۔"[5]

---

[1] کنز العمال، ج ۶، ص ۳۴۶

[2] ایضاً، ج ۶، ص ۳۴۷۔

[3] الطبری محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک، ص ۱۹۵۳۔

[4] فتح الباری، ج ۱۰، ص ۲۴۱ : مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔

[5] ابن اثیر : الکامل ج ۳ ص ۱۵۹

آپ نے معمولی سے گھر کے علاوہ ساری عمر کوئی عمارت نہیں بنوائی۔ حضرت فاطمہؓ جو مختصر سا جہیز لائی تھیں، اس پر تا عمر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ ایک مینڈھے کی کھال تھی جو بستر کا کام دیتی تھی[۱] اوڑھنے کے لیے ایک چادر تھی اگر سر چھپاتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں ڈھانکتے تو سر ننگا ہو جاتا تھا۔[۲] ایک دفعہ کئی فاقوں کے بعد جب بھوک نے زیادہ تنگ کیا تو مدینہ میں ایک بڑھیا کا کھیت سیراب کر کے مٹھی بھر کھجوریں حاصل کیں۔ ایک دفعہ گھر میں کچھ نہ تھا، اپنی تلوار بیچ کر کھانے پینے کا سامان کیا۔[۳]

اموی خلفاء نے بیت المال کو ذاتی خزانہ بنا لیا تھا، اس کا بڑا حصّہ ذاتی تعیش پر صرف ہوتا تھا، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز (م: ۱۰۱ ھ) نے نہ صرف اس کی اصلاح کی بلکہ اپنی تخت نشینی کے بعد شاہی اصطبل کی تمام سواریوں کو بیچ کر ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی اور فرمایا میرے لیے میرا خچر کافی ہے۔[۴]

سرکاری خزانے سے کچھ لینے کی بجائے خود اپنا ذاتی تمام مال بیچ کر قیمت بیت المال میں داخل کر دی۔[۵] خلافت سے پہلے کئی جوڑے کپڑوں کے بدلتے تھے لیکن آخر وقت میں صرف ایک جوڑا رہ گیا تھا۔ اسی کو دھو دھو کر پہنتے تھے۔[۶]

اموی خلیفہ حضرت عمرؓ بن عبد العزیز (۱۰۱ھ) نے تخت خلافت پر قدم رکھنے کے بعد تحفے اور ہدیے قبول کرنے بند کر دیے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کے پاس سیب اور دوسرے پھل بھیجے۔ آپ نے واپس کر دیے۔ بھیجنے والے نے آپ سے کہا کہ ہدیہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے تھے۔ آپ نے جواب دیا "لیکن ہمارے اور ہمارے بعد والوں کے لیے وہ

---

۱ کنز العمال، ج ۶، ص ۴۰۹

۲ ازالۃ الخفا، تذکرہ علیؓ

۳ کنز العمال، ج ۶، ص ۴۰۹

۴ تذکرۃ الخلفاء، ص ۲۳۱

۵ تہذیب الاسماء، ج ۱، ص ۲۳۱

۶ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج ۵، ص ۳۹۶

رشوت ہے ہے[۱]

سلطان صلاح الدین ایوبی (۵۸۹ھ) جس نے ساری زندگی جہاد میں گزار دی اور اسلام کی سربلندی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی، اور کروڑوں روپے رفاہ عام کے کاموں میں صرف کئے، لیکن وفات کے وقت اپنی ملک میں ایک دینار اور چالیس درہم کے علاوہ کسی قسم کے نقد وجنس اور کوئی جائیداد نہیں چھوڑی، اتنا بھی نہ تھا کہ تجہیز وتکفین کے اخراجات پورے ہو سکتے۔ قاضی فاضل نے حلال و پاک مال سے تجہیز وتکفین کا انتظام کیا[۲]

قاضی بہاء الدین ابن شداد کا بیان ہے کہ:

"اس کے پاس کبھی اتنا روپیہ جمع نہیں ہوا کہ زکوٰۃ واجب ہوتی جو کچھ ہاتھ میں آتا سب صدقہ کر دیتا، اپنے پاس ایک حبہ نہ تھا، اس لیے کبھی عمر بھر زکوٰۃ ادا کرنیکی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔"

ناصر الدین محمود (م: ۱۲۶۶ء) برصغیر پاک و ہند کا ایک درویش صوفی منش نہایت شریف النفس خدا ترس، ارباب علم ودانش کا مربی اور منصف بادشاہ تھا، عیش و نشاط کی شاہانہ زندگی سے متنفر تھا، صرف قرآن حکیم کی کتابت کے اجرت پر گزر بسر کرتا تھا[۳] تاریخ فرشتہ میں ہے:

"شاہی خزانے سے پھوٹی کوڑی کا بھی روا دار نہ تھا وہ اپنے آپ کو بیت المال کا امین سمجھتا تھا اس کی ملکہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی اور کام کاج کرتی تھی، اس کو ایک خادمہ تک میسر نہ تھی"[۴]

اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ء) نے برصغیر پاک و ہند میں تقریباً پچاس سال دو ماہ حکومت کی۔ اس مرد درویش نے اپنے ذاتی اخراجات کے لیے شاہی خزانے سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا، بلکہ امور

---

[۱] ابن الجوزی، سیرت عمر بن عبد العزیز، ص ۱۰۶

[۲] کتاب الروضتین، ج ۲، ص ۲۱

[۳] ہسٹری میڈیول انڈیا، ص ۱۸۷

[۴] تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، مقالہ دوم، ص ۲۹۶
اردو ترجمہ خواجہ عبد الحی، ناشر غلام علی اینڈ سنز ۱۹۹۲ء

سلطنت سے فارغ ہو کر ٹوپیاں سی کر اور قرآن مجید کی کتابت کر کے حلال روزی کی اس محدود آمدن سے اپنے گھر کا گزارہ کرتا تھا اپنی وفات سے قبل اس نے وصیت کی تھی کہ :

"چار روپے دو آنے جو ٹوپیوں کی سلائی کے محنتانہ میں سے بچے ہیں۔ میری تکفین پر خرچ کئے جائیں اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن حکیم کی کتابت کر کے کمائے ہیں، میری وفات کے دن فقراء میں بطور صدقہ تقسیم کئے جائیں [1]

موجودہ دور میں تو حکمران اور سربراہ مملکت کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز ذرائع اختیار ہی اسی لیے کئے جاتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور عوام کا پیسہ اپنی ذاتی ملکیت قرار دے کر بے دریغ خرچ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قدریں بدل جانے سے اللہ کی رحمت اور برکت اُٹھ گئی ہے، عوام اپنے حکمرانوں سے نالاں ہیں اور حکمران عوام کو کالانعام سمجھتے ہوئے گریزاں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے اندر اسلامی اور اخلاقی قدروں کو دوبارہ اجاگر کیا جائے تاکہ حاکم و محکوم پورے طور پر ایک دوسرے کا احترام کریں اور ایک فلاحی مملکت کے زیر اثر امن و سکون کی زندگی گزار سکیں۔

طلب اقتدار اسلامی فلاحی مملکت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ خلافت کے لیے یا حکومت کے کسی اور منصب یا عہدے کے لیے وہ لوگ سب سے زیادہ غیر موزوں قرار دیے جاتے ہیں جو خود عہدے حاصل کرنے کے طالب ہوں اور اس کے لیے کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

"تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا فى الارض ولا فسادا [2]"

(وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کریں گے جو زمین پر اپنی بڑائی کے آرزومند نہیں ہوتے اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں)۔

رسول اللہ کا ارشاد گرامی ہے :

---

[1] دی مغل ایمپائر، ص ۳۷۶

[2] قرآن حکیم، القصص، آیت ۸۳

"انا واللہ لانولی علی عملنا ھذا احدًا سالہ اوحرص علیہ"[1]
(خدا کی قسم ہم حکومت کا کوئی منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طالب گار یا حرص رکھتا ہو)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے :
"ان اخونکم عندنا من طلبہ"[2]
(تم میں سب سے بڑا خائن ہمارے نزدیک وہ ہے جو منصب اور عہدے کو خود طلب کرتا ہے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن رضؓ بن سمرہ کو نصیحت فرمائی تھی :
"لاتسئل الامارۃ فانك اذا اوتیتھا عن مسئلۃ وکلت الیھا وان اوتیتھا عن غیر مسئلۃ اعنت علیھا"[3]
(امارت اور اقتدار کی طلب نہ کرنا کیونکہ اگر تو وہ تمہیں طلب کرنے پر ملا تو پھر تم اس کے سپرد کر دیے جاؤ گے اور اگر بغیر طلب کئے ملا تو پھر تمہاری اس پر مدد کی جائیگی)

ان احادیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو اس بنا پر سرکاری مناصب دینے سے انکار فرما دیا تھا کہ انہوں نے خود ان کے حصول کی کوشش کی تھی۔ تاہم اسلام اس بات پر مطلق قدغن بھی نہیں لگاتا۔ اور بعض ناگزیر حالات میں اس بات کی اجازت دیتا ہے۔ اور اہل لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ حضرت یوسفؑ کی طرح اگر ضرورت پیش آئے تو اپنی اہلیت کا اظہار کریں۔

صدر مملکت کے کاسٹنگ ووٹ کی حیثیت

اسلامی مملکت میں عوام کی طرح صدر مملکت کا بھی صرف ایک ووٹ ہے

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، ج ۲، ص ۱۰۵۷
[2] الصحیح للمسلم، کتاب الامارۃ، باب ۲
[3] مصطفیٰ عمارہ، جواہر البخاری، ص ۵۰۵، کنز العمال، ج ۴

اس کی وضاحت حضرت عمرؓ کے ایک طویل خطبہ سے ہوتی ہے جو انہوں نے فتح شام کے بعد ایک مجلس شوریٰ میں کسی مسئلے پر اختلاف ہونے کی صورت میں ارشاد فرمایا تھا۔ طویل خطبہ کا ایک حصہ یہ ہے:

"فانی واحد کاحدکم ... ولست ارید ان تتبعوا هذا الذی اهوی الیہ"[1]

(میرا بھی ایک ووٹ ہے اور اس کی حیثیت وہی ہے جو تم میں سے کسی ایک فرد کے ووٹ کی ہو سکتی ہے۔ میں یہ تو نہیں چاہتا کہ میری جو خواہش ہو تم اس کی پیروی کرو)

اس خطبہ میں "کاحدکم" کا لفظ غور طلب ہے۔ آج کل کے صدارتی نظام میں بھی صدر مملکت کی رائے بعض حالتوں میں دو ووٹوں کے برابر ہوتی ہے یا اسے ویٹو کا حق یعنی خصوصی اختیارات کا استعمال بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے صاف کہہ دیا کہ گو میں خلیفہ ہوں، تاہم اختلافی مسائل میں میری رائے عام ارکان شوریٰ کی طرح صرف ایک ووٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ویٹو کا حق

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کے مقابلے میں خصوصی اختیارات استعمال کئے اور ویٹو سے کام لیا۔ اور منکرین زکوٰۃ اور مدعیان نبوت کی سرکوبی کے لیے جہاد کا حکم دے کر صحابہؓ کی رائے کو رد کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے صرف دو فیصلے ہیں جن سے اس معاملے میں غلط فہمی پیدا ہوئی ہے ایک لشکر اسامہ کا معاملہ، دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا مسئلہ۔ ان دونوں معاملات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے محض اپنی رائے پر فیصلہ نہیں کر دیا بلکہ اپنی ذاتی رائے کے حق میں کتاب و سنت سے استدلال کیا تھا۔

لشکر اسامہؓ کی روانگی کے معاملے میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جس کام کا فیصلہ خود نبی کریمؐ اپنی حیات طیبہ میں کر چکے تھے اسے حضورؐ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انجام دینا میرا فرض ہے میں اسے بدل دینے کے اختیارات نہیں رکھتا۔[2]

مرتدین اور منکرین زکوٰۃ کے بارے میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جو شخص بھی نماز اور زکوٰۃ میں فرق

---

[1] کنز العمال، ج ۳، ص ۱۳۴

[2] السیوطی جلال الدین، تاریخ الخلفاء، ص ۱۷

کرے اور یہ کہے کہ میں نماز تو پڑھوں گا لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کروں گا۔ وہ مرتد ہے اسے مسلمان سمجھنا ہی غلط ہے[1]

یہی دلائل تھے جن کی بنا پر صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ یہ اگر ویٹو ہے تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کا ویٹو ہے نہ کہ سربراہ مملکت کا۔ حقیقت میں اسے ویٹو کہنا ہی غلط ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے استدلال کو تسلیم کرنے کے بعد اختلاف کرنے والے صحابہ کرامؓ قائل ہو گئے تھے اور اپنی سابقہ رائے سے رجوع کر لیا تھا۔

عوام کے حقوق کا تحفظ

ا۔ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت

اسلامی فلاحی ریاست میں عوام اور شہریوں کے اوّلین حقوق یہ ہیں کہ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہوں، اور جائز قانونی وجوہ کے سوا اور کسی وجہ سے ان پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔ حجۃ الوداع کے جم غفیر کے سامنے آپؐ نے جو خطبہ دیا اس میں پوری روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"الا ان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم هذا فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا"[2]

(سنو! تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہاری عزت و آبروئیں ویسی ہی محترم ہیں جیسی کہ تم حج کے اس دن، اس شہر اور اس مہینے کو محترم سمجھتے ہو)۔

البتہ اسلام کے قانون کی وجہ سے اگر کسی شخص پر جان، مال، یا آبرو کا کوئی حق واجب ہوتا ہے تو وہ اسی سے اسلام کے ٹھہرے ہوئے قواعد و ضوابط کے تحت ہی وصول کیا جا سکتا ہے۔ مملکت کے ہر فرد کی عزت و آبرو کی حفاظت اس کا بنیادی حق ہے۔ سورۃ حجرات میں اس بنیادی حق کی پوری

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، ج ۱، ص ۱۸۸

[2] فتح الباری، ج ۳، ص ۴۵۹

تفصیل موجود ہے، ان میں سے چند کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے:

ارشاد الٰہی ہے:

(ا) "لا یسخر قوم من قوم[1]"

(تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے کا مذاق نہ اڑائے)

(ب) "ولا تنابزوا بالالقاب[2]"

(تم آپس میں ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو)

(ج) "ولا یغتب بعضکم بعضا[3]"

(تم ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی نہ کرو)

موجودہ روش اپنی خطرناک اور غلط موڑ پر پہنچ چکی ہے کہ ہماری اسلامی ریاست میں سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہی ہیں، اور ایک دوسرے کو گالی گلوچ اور تضحیک کا نشانہ بنا رہی ہیں اور ایک دوسرے پر جھوٹے الزام اور بہتان لگائے جا رہے ہیں۔ یہ سب غیر اسلامی ہے اور مذکورہ آیات قرآنی کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

۲۔ معاشی تحفظ

اسلامی فلاحی مملکت میں شہریوں کے معاشی تحفظ کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے کہ ریاست اپنے دائرے میں کسی شہری کو زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہنے دے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان یہ فرما دیا تھا کہ:

"السلطان ولی من لا ولی له[4]"

(حکومت ہر اس شخص کی کفیل اور ذمہ دار ہے جس کا کوئی کفیل اور ذمے دار نہ ہو)

ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:

---

[1] قرآن کریم، الحجرات، آیت: ۱۱

[2] ایضاً

[3] ایضاً، آیت: ۱۲

[4] مصطفیٰ عمارہ، جواہر البخاری، ص ۲۷۰

"من ترك كلاً فعلينا"[1]

(جو شخص کوئی قرض یا بے سہارا گھرانہ چھوڑ کر فوت ہو جائے تو وہ ہمارے ذمّے ہے)

اس بارے میں اسلام نے مسلم اور غیر مسلم شہریوں کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا، بلکہ اس میں اس بات کی ضمانت ہے کہ مسلمان کی طرح کوئی غیر مسلم بھی اسلامی ریاست میں بھوکا، ننگا، اور بے ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک غیر مسلم شہری کو بھیک مانگتے دیکھا تو آپ نے فوراً اس کا جزیہ معاف کر دیا اور بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور خزانچی کو لکھا:

"واللہ ما انصفنا ان اکلنا شیبتہ ثم نخزلہ عند الھرم"[2]

(اللہ کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا کہ جوانی میں ہم اس سے کما لیتے رہے اور بڑھاپے میں ہم اسے ذلیل و خوار کریں)

حضرت خالدؓ بن ولید نے حیرہ فتح کرنے کے بعد وہاں کے غیر مسلم باشندوں کو جو دستاویز تیار کر کے دی، اس میں وضاحت تھی کہ "جو شخص بوڑھا ہو جائے گا یا کسی آفت یا مصیبت میں گرفتار ہوگا یا مفلس ہو جائے گا، اس سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا اور مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی"[3]

۳۔ شخصی آزادی کی حفاظت

اسلامی مملکت میں ہر شہری کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ اسکو شخصی آزادی کا تحفظ ملے۔ اسلام میں کسی شخص کی آزادی کا حق اس کا جرم ثابت کئے بغیر اور اسے صفائی کا موقع دیے بغیر چھینا نہیں جا سکتا۔ ایک مرتبہ مدینے میں کچھ لوگ شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے تو ایک صحابی نے حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کے دوران کھڑے ہو کر عرض کیا کہ میرے ہمسایوں کو کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟ حضورؐ نے دو مرتبہ ان کے سوال کو سنکر سکوت فرمایا تاکہ کوتوال شہر اگر گرفتاری کے لیے کوئی معقول وجہ رکھتا ہے تو اٹھ کر بیان کرے لیکن جب

---

[1] مصطفیٰ عمارہ، جواہر البخاری، ص ۲۶۹، ۲۷۰

[2] امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۷۲

[3] ایضاً، ص ۸۵

تیسری مرتبہ ان صحابی نے اپنا سوال دھرایا اور کوتوال نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو حضورؐ نے حکم صادر فرمایا کہ ان کے ہمسایوں کو رہا کر دو[1] یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ جب تک کسی شہری کے خلاف الزام کا ثبوت موجود نہ ہو اسے گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام میں حبس (قید کرنا) دو قسم کا ہے:

(۱)۔ ایک حبس عقوبت یعنی عدالت سے سزا پا کر کسی شخص کو قید کیا جائے۔

(۲)۔ حبس استظہارہ۔ اس کا مطلب ہے ملزم کو تفتیش کی خاطر قید رکھنا۔ ان دونوں صورتوں کے سوا اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے[2]

امام ابو یوسفؒ نے بھی اپنی کتاب میں یہی بات لکھی ہے کہ:

"کسی شخص کو محض تہمت کی بناء پر قید نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف الزام پر کسی کو قید نہیں کیا کرتے تھے۔ ضروری ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں عدالت میں حاضر ہیں۔ مدعی اپنا ثبوت پیش کرے اور اگر وہ اپنا الزام ثابت کرنے میں ناکام رہے تو مدعا علیہ کو رہا کر دیا جائے[3]"

حضرت عمرؓ نے بھی ایک مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ:

"لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر عدل[4]"

(اسلام میں کسی آدمی کو بغیر ثبوت کے ناحق گرفتار نہیں کیا جا سکتا)

اسلام اس بات کو صریح طور پر ناانصافی قرار دیتا ہے کہ کسی شخص کو الزام ثابت کئے بغیر گرفتار کر لیا جائے اور صفائی کا موقع دیے بغیر اسے قید خانے میں ڈال دیا جائے بلکہ وہ تو اس بات کو واجب قرار دیتا ہے کہ کسی کی آزادی صلب کرنے کے لیے اس پر متعین الزام لگایا جائے اور کھلی عدالت میں اس

---

[1] سنن ابی داؤد

[2] امام خطابی۔ معالم السنن شرح ابو داؤد، کتاب القضاء

[3] امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۰۷

[4] مؤطا امام مالک، باب شرط الشاہد، ج ۲، ص ۹۶، مصفّٰی شرح مؤطا شاہ ولی اللہؒ کتب خانہ رحیمیہ دہلی ۱۳۴۶ء

پر مقدمہ چلایا جائے اور اسے اپنے دفاع کا پورا حق دیا جائے ۔

اموی دور میں ذرا سی بدگمانی اور سوءِ ظن پر سزا دینا عام تھا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اس طریقہ کو بالکل بند کر دیا۔ موصل میں چوری اور نقب زنی کی وارداتیں کثرت سے ہوتی تھیں، یہاں کے حاکم غسانی نے لکھا کہ "جب تک لوگوں کو شبہ میں نہ پکڑا جائے گا اور سزا نہ دی جائے گی اس وقت تک یہ وارداتیں بند نہیں ہو سکتیں ۔ آپ نے لکھا "صرف شرعی ثبوت پر مؤاخذہ کرو ۔ اگر حق ان کی اصلاح نہیں کر سکتا تو خدا ان کی اصلاح نہ کرے[1]

ابو جعفر منصور عباسی خلیفہ نے بھی خاص طور پر کوفہ کے حاکم عیسٰی بن موسیٰ کو لکھا تھا" کہ کسی شخص کو محض شبہ اور گمان پر سزا نہ دی جائے جب تک کہ پورا ثبوت موجود نہ ہو[2]"

۴۔ اظہار رائے کی آزادی

اسلامی فلاحی مملکت میں ہر شہری کو اپنی رائے کے اظہار کا پورا پورا حق حاصل ہے ۔ اگر خلیفہ وقت یا حکام کتاب و سنت کا لحاظ نہ رکھیں تو ان پر شہریوں کو تنقید کا استحقاق حاصل ہے ۔ خلفائے راشدینؓ پر تنقید ہوتی تھی ۔ عوام ان کا محاسبہ کرتے تھے ، اور خلفائے راشدینؓ نہ صرف ان کو تنقید اور احتساب کی اجازت دیتے تھے بلکہ حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے ۔" رسول اللہ ﷺ نے ایک سال کھجوروں کی پیوند کاری سے روک دیا تو اگلے سال کھجوروں کی پیداوار میں کمی آگئی ۔ آپ ﷺ نے اس کی وجہ پوچھی تو لوگوں نے عرض کیا کہ پیداوار میں کمی کا اصل سبب ان کی پیوند کاری کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے ، آپ نے فرمایا ۔ میں بھی انسان ہوں ، تم لوگ اپنا اصل طریقہ جاری رکھو[3] " اذا کان شیئًا من امور دنیاکم فشأنکم به "

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی ہی تقریر میں الاعلان کہہ دیا تھا :

" اگر میں سیدھا چلوں تو میری مدد کرو ، اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو[4]"

---

[1] سیوطی ، تاریخ الخلفاء ، ص ۲۳۸

[2] محمد بن جریر الطبری ، تاریخ الامم والملوک ، ج ۱۰ ، ص ۳۷ ، ۴

[3] الجامع الصحیح للبخاری ، کتاب المضاربۃ ، ج ، ص

[4] ابن سعد ، الطبقات الکبریٰ ، ج ۳ ، ص ۱۲۹

حضرت عمرؓ نے ایک بار جمعہ کے خطبہ میں اس رائے کا اظہار کیا کہ کسی شخص کو چار درہم سے زیادہ حق مہر مقرر کرنے کی اجازت نہیں۔ ایک عورت نے وہیں ٹوک دیا کہ آپ اس حد مقرر کرنے والے کون ہیں۔ آپ کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔ "وان اٰتیتم احدٰھن قنطارًا" (اگر تم اپنی عورتوں کو ڈھیر سا مال دے دو) اس آیت میں بہت زیادہ مال دینے کا اشارہ ہے، حضرت عمرؓ نے اسی وقت اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور فرمایا۔ آج ایک عورت ایک مرد پہ بازی لے گئی ہے"[۱]

اسی طرح ایک بار حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اسمعوا واطیعوا" (سنو اور اطاعت کرو)

حضرت سلمان فارسی جھٹ بول اُٹھے۔ "لا نسمع ولا نطیع" (ہم نہ سنیں گے نہ مانیں گے) پہلے یہ بتائیے کہ سب کے حصے میں ایک ایک چادر آئی ہے، آپ نے دو چادریں کہاں سے لیں۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ اس بات کا جواب دیں۔ انھوں نے وضاحت کی کہ دوسری چادر میں نے اپنے حصّے کی باپ کو دی ہے"[۲]

ایک مجلس میں حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا، اگر میں بعض معاملات میں ڈھیل اختیار کروں تو تم کیا کروگے"؟ حضرت بشر بن سعد نے کہا، "اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم آپ کو تیر کی طرح سیدھا کردیں گے" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "تب تم بڑے کام کے لوگ ہو"[۳]

حضرت عثمانؓ کو لوگوں نے سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ مگر انھوں نے جبراً کسی کو روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ اعتراضات اور تنقیدوں کے جواب بھرے مجمع میں اپنی صفائی میں پیش کیے۔

حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں بڑے صبر اور حوصلے سے کام لیا۔ خوارج نے ان کے خلاف انتہائی بدزبانی کی، بلکہ ایک مرتبہ تو ایک خارجی کو لوگ پکڑ کر لائے کہ آپ کو گالیاں دے رہا ہے اور کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم! میں علیؓ کو قتل کردوں گا۔ اس کے باوجود حضرت علیؓ نے اسے کچھ نہیں کہا اور برداشت

---

[۱] ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۴۶۷ (آیت وان آتیتم احدھن قنطارا)

[۲] ابن جوزی، سیرت عمر بن خطاب، ص ۱۲۷

[۳] کنز العمال، ج ۵، ص ۲۴۱

وتحمل کا مظاہرہ فرمایا۔ جو لوگ بھی آپ سے بدزبانی کرتے تھے انھیں چھوڑ دیتے تھے۔ لوگوں سے فرماتے تھے کہ اگر تم چاہو تو ان کی بدزبانی کا جواب بدزبانی سے دے لو، مگر جب تک یہ لوگ عملی طور پر باغیانہ رویہ کا اظہار نہیں کرتے، ان پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ صرف زبانی جرم کرنے سے انہیں قید بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

ایک اسلامی فلاحی مملکت میں ہر طبقہ کے لوگوں کے لیے ترقی کے یکساں مواقع موجود ہوتے ہیں۔ عہدوں کی تقسیم میں استحقاق کے اصول کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ایک ادنیٰ درجے کا آدمی بھی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر سربراہ مملکت کی حیثیت سے متمکن ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی فلاحی اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جس میں ہر شخص کی ضروریات کو مدنظر رکھا گیا۔ ہر ایک کے ساتھ مساوی سلوک کے مواقع فراہم کیے گئے۔ باصلاحیت لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق امور سپرد کیے گئے حتیٰ کہ فوجوں کی ترسیل میں نوعمر غلام زادوں کو بھی سپہ سالاری کے منصب سے سرفراز کیا گیا، حصول انصاف کو آسان اور سہل تر بنایا گیا، عوام کی فلاح وبہبود اور امن وامان کا قیام ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا۔ زہد وتقویٰ، پرہیزگاری قناعت پسندی اور نیکی کو پروان چڑھایا، سادگی، رحمدلی اور خداترسی کو رواج دیا۔ غریبوں ناداروں اور مفلوک الحال لوگوں کی سرپرستی کی گئی عیش ونشاط اور دنیا پرستی کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ شفقت، فیاضی، جفاکشی اور شجاعت وجرأت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ تعصب اور تنگ نظری سے بالا، روادارانہ پالیسی کی حمایت کی، عدل وانصاف کا بول بالا کر کے مملکت میں مکمل امن وسکون اور خوش حالی کو فروغ بخشا۔

رسول اللہ کی اسلامی فلاحی مملکت کا نصب العین ہی اشاعت اسلام اور اسلامی ریاست کا استحکام تھا، لہٰذا اس کے لیے جتنی بھی خوبیاں اور بھلائیاں ممکن ہو سکتی تھیں ان کو اپنایا گیا اور ان کی ترویج کے لیے ہر امکانی کوشش کو سراہا گیا۔

رسول اللہ کے بعد آپ کے خلفاء راشدینؓ نے اسی نظام کو مزید وسعت دی اور ریاست کو اسلامی فلاحی مملکت بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اسی کا اثر تھا کہ بعد میں آنے والے حکمرانوں اور سربراہوں نے اپنی اپنی وسعت کے مطابق ریاست اور عوام کی بھلائی اور بہتری کے لیے شب و روز کام کیا۔ حتیٰ کہ بعض حکمرانوں نے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کر دی اور رسولؐ اللہ کے اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طرز خلافت کو اپنانے میں بھرپور کردار ادا کیا اور شہرت دوام حاصل کی۔

اسلامی فلاحی مملکت کے قیام کے لیے عملی تجاویز

موجودہ دور میں فلاحی مملکتوں میں جو نمایاں خصوصیات ملتی ہیں وہ آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے جناب نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کی عطا کردہ ہیں۔ انہی کو لے کر بعد میں آنے والی حکومتوں نے اپنے اصول وضع کئے۔ جن کی روشنی میں ان کے زیرِ نگران مملکتیں صحیح معنوں میں کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار رہوئیں۔ انہوں نے جن خصوصیات اور تصورات کو پیش رکھ کر فلاحی مملکتوں کی بنیادیں استوار کیں ان کا اجمالی خاکہ یہ ہے۔

۱۔ حاکمیت اعلیٰ کا تصوّر

اسلامی فلاحی مملکت میں جس بات کو اولیت دی جائے۔ وہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کا تصوّر ہے یعنی اس پوری کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے اس لیے حاکمیت اعلیٰ اور امر کا حق صرف اسی کو پہنچتا ہے اس کی مملکت میں اس کی مخلوق پر اس کے سوا کسی بندے کا حکم نافذ ہونا صریحاً غلط ہے۔ حکومت صرف اللہ کا حق ہے۔ قانون بنانا بھی اللہ کی شان ہے۔ انسان، انسان کا خادم ہو سکتا ہے حاکم نہیں ہو سکتا۔ قانون الٰہی ہی نافذ ہوگا۔

۲۔ سیرت طیّبہ سے راہنمائی

قانون کی تشریح اور وضاحت کے لیے سیرت طیّبہ سے راہنمائی حاصل کی جائے۔ حضورؐ نے ۱۴۰۰ سال پہلے فلاحی مملکت کی تشکیل کے لیے جو اصول و قوانین وضع فرمائے وہ آج ہر لحاظ سے پسندیدہ اور قابلِ عمل ہیں۔ مثلاً بے روزگاروں، معذوروں اور غرباء و مساکین کی امداد۔ عدل و انصاف کا نظام۔ امن و سلامتی کا نظام وغیرہ جبکہ برطانیہ جیسے مہذب اور متمدن ملک میں امداد محتاجگان کا قانون ۱۹۰۱ء میں بنا۔

رسول اللہؐ کے نظام حکومت کے ساتھ خلفائے راشدینؓ کے دور حکومت اور نظام کفالت عامہ پر یونیورسٹیوں اور تحقیقاتی اداروں میں ریسرچ کروائی جائے اور ان کے خدوخال واضح کر کے ان کی روشنی میں اسلامی فلاحی مملکت کی بنیادوں کو استوار کیا جائے۔

۳۔ زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کی اصلاح

زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے جس کی ادائیگی ہر صاحب نصاب پر

فرض ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کی وصولی اور مصارف کا خصوصی اہتمام کیا۔ آپ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے بھی اسی پر عمل کیا۔ جس سے غربار و مساکین اور محتاجوں کی امداد کا مسئلہ احسن طریق طے ہوا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے دور خلافت میں زکوٰۃ کا نظام اس قدر عمدہ ہو گیا تھا کہ کوئی وصول کرنے والا نہیں ملتا تھا۔ اس لیے فلاحی مملکت کی تعمیر کے سلسلے میں زکوٰۃ کا نظام پوری دیانتداری کا متقاضی ہے ۔

۴ ۔ محتسب کی ضرورت

احتساب کا ادارہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کا کسی وقت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں محتسب کے ذریعے ہر چیز کی نگرانی ہوتی تھی جس سے خاطر خواہ فوائد حاصل ہوئے۔ اس وقت یہ ادارہ عامل السوق کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے ذمہ سختی سے قیمتوں پر قابو پانا، ذخیرہ اندوزی اور دیگر خرابیوں کا سد باب تھا۔ موجودہ دور میں اس میں ہر شعبہ اور محکمہ، ہر قسم کی برائیوں اور خرابیوں کا محاسبہ شامل کیا جائے۔ عوام سے زیادہ حاکموں کا احتساب زیادہ ضروری ہوتا ہے ۔

۵ ۔ بیت المال کو موثر بنانا

چوری، ڈاکہ زنی، دھوکہ دہی اور پیشہ وارانہ گداگری جیسی خباثتیں اس وقت صحیح طور پر ختم ہونگی جب بیت المال کے نظام کو بہتر اور مؤثر بنایا جائے گا۔ کفالت عامہ فنڈ قائم کیا جائے جس میں زکوٰۃ و صدقات، عشر و خیرات اور مخیر حضرات کے عطیات جمع کئے جائیں ۔ اس کے ذیلی دفاتر ہر ضلع اور تحصیل کی سطح پر قائم کئے جائیں کفالتی اداروں میں تربیت اطفال مراکز ہوں ۔ مفت شفاخانے ہوں ، جن میں معذوروں، نابیناؤں مفلوج مریضوں اور بے سہارا یتیموں اور محتاجوں کی مفت دیکھ بھال کی جائے ۔ مہمان خانے وظائف اور امداد کے مراکز قائم کئے جائیں ۔ اسلامی حکومت کا بلا سود بینک ایسے وظائف کا انتظام کر سکتا ہے۔

۶ ۔ سادگی

حکام سے لے کر عوام تک سب سادگی اختیار کریں۔ حکام پہلے نمونہ پیش کریں تاکہ عوام ان کی تقلید کریں ۔ سادگی کے ذریعہ غربت و افلاس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

۷ ۔ سامان تعیش

سامان تعیش پر پابندی لگائی جائے اور کسٹم ڈیوٹی کی شرح بڑھائی جائے۔ اور بازارہ مارکیٹیں بند کی جائیں۔ حکومت کا ہر طبقہ اس قانون کی پابندی کرے اور سختی سے عمل درآمد کرایا جائے ۔ غیر ملکی اشیاء کی درآمد سختی سے بند کی جائے تاکہ سادگی کو فروغ حاصل

ہو اور غربت و محتاجی کا قلع قمع ہو۔

۸۔ غیر شرعی رسومات کا خاتمہ

تقریبات اور شادی بیاہ میں غیر شرعی اور فضول رسومات کو ختم کیا جائے۔ جہیز کا مطالبہ، اس کی نمائش کی حوصلہ شکنی کی جائے، لڑکیوں کا وراثت میں مقررہ باقاعدہ حصّہ دیا جائے تاکہ خواتین کا استحصال نہ ہو۔

۹۔ رشوت ستانی اور دیگر رذائل کا استیصال

رشوت ستانی اور دیگر خرابیاں جن میں سمگلنگ، چور بازاری، منشیات کا کاروبار وغیرہ شامل ہیں ان کو بالکلیہ ختم کر دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ایسے قوانین وضع کئے جائیں جن سے ان ملوث لوگوں کو ایسی کڑی سزا دی جائے کہ دیگر لوگ محتاط ہو جائیں اور ایسی لعنتوں سے توبہ کر جائیں۔ یہ اسی صورت ممکن ہے جبکہ سرکاری ملازمین کے مشاہرے اور ذرائع آمدنی معقول ہوں اور انہیں ہر ممکنہ سہولیات حاصل ہوں۔

۱۰۔ ابلاغ عامہ اور اصلاح معاشرہ

فلاحی مملکت کا قیام اس وقت شرمندہ تعبیر ہوگا جبکہ ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع بھرپور کردار ادا کریں اور معاشرہ کی اصلاح میں پوری قوت صرف کریں۔ عریانی، فحاشی اور مخرب الاخلاق مواد اور لٹریچر کو نہ صرف تشہیر کرنے سے روکیں بلکہ ان پر ہر قسم کی پابندی لگا کر معاشرے کو آلودگی سے بچائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ان زریں اصولوں پر کسی معاشرے کو استوار کیا جائے تو وہ ایک اسلامی فلاحی اور مثالی معاشرہ بن سکتا ہے، جو پوری دنیا کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہوگا۔ اللہ کرے ہم اپنے ملک میں کم از کم ایک اسلامی، فلاحی مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔